ندوہ وندوی ایک ہی فکر کے دونام

تحریر: حافظ عتیق الرحمٰن گورچانی (مدیر جامعہ اصحاب صفہ ڈیرہ غازیخان پاکستان)

Atiqurrehman001@gmail.com

00923325292433

برصغیر میں شمع اسلام کا سورج تو عہد نبوی و عہد صدیقی میں ہی طلوع ہو گیا تھا تاہم باضابطہ طور پر مسلم تاجروں اور مسلم سپہ سالاروں کی آمد کے سلسلہ کا آغاز عہد فاروقی میں ہوا جو بدستور عہد اموی و عہد عباسی میں جاری رہا۔ محمد بن قاسم کی آمد وواپسی کے بعد اسلام کا پیغام برصغیر کے طول عرض میں پھیل گیا جس کے نتیجہ میں مسلمانوں نے برصغیر پر ایک ہزار سال کے قریب تنہا حکمرانی کی۔ اہل حکم و حشم اور عامۃ الناس کی بے عملیوں کے سبب دورزوال شروع ہوا اور انگریز نے برصغیر میں تجارت کی غرض سے قدم رکھا جو بعد میں انگریز کے غاصبانہ قبض پر منتج ہوا۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے اخلاف نے مسلمانوں کی جمعیت کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کو حصول آزادی کی شاہراہ پر گامزن کیا۔ مسلمان اگرچہ حکمرانی سے محروم کر دیئے گئے تھے مگر علم وفن کے مراکز دینی مدارس اور اہل علم وخانقاہوں کا نظام مسلمانوں کی معاشرتی رہنمائی کے لئے جاری رہا۔ انگریز نے اگرچہ مسلمانوں کے نظام تعلیم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور مسلمانوں کو معاشرہ سے اچھوت کرنے کے لئے انگریزی نظام تعلیم لارڈ میکالے کی سفارشات پر شروع کیا تو ایسے میں برصغیر میں مولانا قاسم نانوتوی نے مسلمانوں کے عقائد و اسلامی تہذیب و ثقافت کو محفوظ بنانے کے لئے اپنا کردار ادا کرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کو ملک میں مقام عزت دلانے کے لئے معاشرہ کے بدلتے تیور و حالات سے نبرد آزمائی کے لئے سرسید احمد خان نے مدرسۃ العلوم اور محمڈن کالج قائم کیا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کا پس منظر

مولانا محمد علی مونگیری نے برصغیر میں دارلعلوم دیوبند اور علی گڑھ کی تعلیمی تحریکوں کی انتہا کو دیکھتے ہوئے دونوں کی ضرورت وحاجت کو تسلیم کرتے ہوئے پل کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں کو جب دیکھا کہ مناظروں، مباحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں میں الجھ کر مسلمان اپنے مقام امتیاز سے گرتے چلے جارہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ معمولی وفروعی اختلافات فقہ و مسلک کی بناپر اپنی قوت وطاقت کو کمزور کر رہے ہیں جس کا بدیہی نتیجہ مسلمانوں کو ابدی نقصان کی صورت میں ظاہر ہوتا سے بچانے کے لئے مولانا محمد علی مونگیری انجمن ندوۃ العلماء کی بنیاد 1310ھ میں رکھی اور بعد ازاں اپنے تصورات کو عملی سانچے میں ڈھالنے کے لیے

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بنیاد 1312ھ مطابق 1892ء میں رکھی۔ مولانا محمد علی مونگیری کی اس فکر کو ہندوستان کے بلند پایہ دانشوروں اور علماء نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے صف آراء بھی ہو گئے۔

ندوۃ العلماء مسلمانوں میں اعتدال و رواداری کو فروغ دینے کے لیے قائم ہوا اور ندوۃ نے قدیم نظام تعلیم کے بارے میں پائے جانے والے تصور کو غلط ثابت کیا کہ پرانے نظام تعلیم میں حذف و ترمیم بدعت اور تحریف ہے۔ کیونکہ ندوۃ العلماء کے منتظمین کی یہ فکر تھی کہ دین ابدی اور غیر متبدل ہے لیکن نظام تعلیم ایک تغیر پذیر سی ہے جس میں حالات و واقعات کے پیش نظر قطع برید کرنا درست ہے۔[1]

ندوۃ العلماء کی سرپرستی و نگرانی کرنے والوں میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، مولانا عبد الحق حقانی، قاضی سلمان منصور پوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری، حکیم سید عبد الحی، نواب سید علی حسن خان، حکیم ڈاکٹر عبد العلی حسنی ندوی قابل ذکر نام ہیں۔

بانی تحریک ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیری اور ندوۃ کو جدید و قدیم خطوط پر بہتر انداز سے گامزن کرنے والے علامہ شبلی نعمانی کے اقتباسات پیش خدمت ہیں:

مولانا محمد علی مونگیری لکھتے ہیں کہ "اس زمانہ میں حالت بدل گئی ہے، وہ اعتراضات جو پہلے فلسفہ میں کئے گئے اب انہیں کوئی نہیں پوچھتا، اور نہ وہ فرقے اعتراضات کرنے والے باقی رہے، اب ان کے اعتراضات اور جوابات سیکھنے کی ضرورت نہ رہی، اب نیا عالم، نیا دانہ، نیا پانی ہے جدید فلسفہ کی بنا پر اس زمانہ کے مخالفین اسلام نے نئے نئے قسم کے اعتراضات کئے ہیں جو پہلے نہ تھے ان کا شافی طور پر جواب دینا قدیم فلسفہ کے جاننے سے نہیں ہو سکتا اگرچہ کوئی کیسا ہی دعوی کرے، وجہ اس کی یہ ہے کہ معترض کا جواب شافی اس وقت ہو سکتا ہے جب اس کے منتہائے اعتراض کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کس بنا پر اس نے اعتراض کیا ہے۔"[2]

علامہ محمد شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ "یہ یونانی علوم نہ ہمارے مذہبی علوم ہیں نہ ہمارے مذہب کی فہم و معرفت ان پر موقوف ہے، امام غزالی نے اپنے زمانہ سے ان علوم کو علماء کے نصاب میں اس لئے داخل کیا تاکہ ان یونانی علوم کے اثر سے جن کو اس زمانہ میں زیادہ تر باطنیوں نے پھیلا رکھا تھا، علماء اسلام واقف ہو کر اس زمانہ کے الحاد کا مقابلہ کر سکیں، لیکن اب نہ وہ ملحد رہے، نہ وہ یونانی علوم رہے، نہ ان کے مسائل کی صحت کا یقین عقل کے مدعیوں کو رہا، اس لئے ان کا اثر خود بخود زائل ہو گیا اور اب ان سے اسلام کو کسی

---

[1]۔ ہندوستانی مسلمان، سید ابوالحسن علی ندوی، ص140

[2]۔ مکاتیب محمدیہ، بحوالہ اسلامیت و مغربیت کی کشمکش، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس نشریات اسلام کراچی، ص 91-92

گزند کا خوف نہیں رہا، اب اس کی جگہ نئے علوم ہیں، نئے مسائل ہیں، نئی تحقیقات ہیں، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے علماء ان نئی چیزوں سے واقف ہو کر اسلام کی نئی مشکلات کا حل نکالیں اور نئے شبہات کا تحقیقی جواب دیں۔"[3]

ندوۃ العلماء کی خصوصیات

ندوۃ العلماء کی خصوصیات میں سے ہے کہ اسلامی علوم اور درسی نصاب میں حسب ضرورت ترمیم کی جاسکتی ہے، قرآن مجید کی تعلیم کا اس انداز سے اہتمام کیا گیا کہ اس کتاب ہدایت سے رہنمائی حاصل کرنا آسان ہو جائے، عربی زبان وادب پر ندوۃ نے خصوصی توجہ اس طرح کی کہ وہ زندہ وجاوید زبان ہے اور بجز اس کے قرآن وسنت کو سمجھنا محال ہے۔ ندوۃ نے بعض علوم کو جو عصر حاضر میں قابل استفادہ نہیں تھے کو یا تبدیل کیا یا ان میں ترمیم کر دی اس کے ساتھ وقت وحالات کی ضرورت و تقاضوں کے مطابق ایسی کتب کو شامل نصاب کر دیا جن سے فائدہ اٹھانا لازم تھا۔ ندوۃ کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا تھا کہ وہ داعی اسلام اور شارح دین حنیف بنیں اور قدیم وجدید علوم سے بیک وقت فیض حاصل کر کے اشاعت اسلام میں مشغول ہونے والے افراد تیار ہو پائیں۔ ندوۃ کے فضلاء نے اسلامی ادب، علم کلام، تاریخ اور سیرت النبی پر گراں قدر کتب مہیا کیں جن سے کروڑوں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔[4]

ندوۃ العلماء کا امتیاز اور پیغام

ندوۃ العلماء کے قیام کا محرک اصلی یہ تھا کہ مسلم معاشرہ کو علمی ودینی مسائل پر سنجیدہ اور مؤثر انداز میں پیش کرنے اور مستشرقین ومستغربین کی جانب سے اٹھائے جانے والے سوالات جن کی وجہ سے نوجوان نسل کا اسلام پر اعتماد متزلزل ہو گیا تھا کو دور کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں مولانا سید محمد علی مونگیری جیسی بالغ نظری، علامہ شبلی جیسے متکلم دوراں اور سیرت نگار ومؤرخ اور علامہ شبلی کے طرز پر علمی کام کا بار اٹھانے والے علامہ سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی وغیرہ جیسی شخصیات نے بنیادی کردار ادا کیا۔ تاہم وقت کے گزرنے نے مسلم وغیر مسلم ممالک میں ان سے بلند پایہ ادیب ومؤرخ اور متکلم مفقود ہو گئے۔ یہ حالات خوفناک ہے ایسے میں ضروری ہے کہ متعلمین ندوہ اور مسلم ممالک کے علماء وفضلاء اس بھاری ذمہ داری کو سنبھالتے ہوئے نئی نسل جو یورپ میں تعلیم حاصل کر رہی ہے یا ان کی تہذیب وثقافت سے متاثر ہو رہی ہے کا اعتماد اسلامی تہذیب وتمدن اور شریعت اسلامی پر قائم کرنے کے لئے مختلف میادین علمی میں خصوصی مقام حاصل کریں۔ دینی تعلیم کا اجمالی وتفصیلی طور پر دقت نظر کے ساتھ مطالعہ

---

[3]۔ حیات شبلی (سیرت علامہ شبلی نعمانی) سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ انڈیا، طبع جدید، 2008ء، ص26

[4]۔ ہندوستانی مسلمان، ص141

کریں اور معاشرہ میں واقع اہل علم کی کمی کو دور کرنے کے لئے کم از کم علامہ شبلی کا طرز تحریر، علامہ سید سلیمان ندوی کی متانت، مولانا عبد السلام کی ادبیت اور مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا ناظم ندوی کا ساعربی ذوق اختیار کریں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک وقت تک فروعی مسائل علم کلام، تمدنی مسائل، باہمی اختلاف اور نظام تعلیم کی اصلاح وترقی کی تحریک کو ٹھنڈا کر دیں تاکہ مسلم معاشرہ کی اولین ضروریات کا سامان وافر مہیا ہو سکے۔[5]

نصاب تعلیم

ندوۃ العلماء کے نصاب و نظام تعلیم کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس نے نصاب تعلیم کو تغیر وترقی پذیر ذریعہ تعلیم وتربیت سمجھا ہے اسی بناپر دینی تعلیم میں جہاں پر ترمیم و اضافہ کو رواج دیا اور اس کو آسان و قابل فہم بنانے کی سعی کی وہیں پر ندوۃ العلماء نے یونانی فلسفہ و منطق اور علم کلام کے رد میں موجود نصابی کتب کے بڑے حصہ کو جو غیر ضروری تھا کو حذف کر کے اس کی جگہ انسانی معاشرہ کی ضرورت اور دور جدید کے تقاضوں کے عین مطابق نئے علوم کو شامل نصاب کیا جن میں علم ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ و دیگر جدید کتابوں سے متمتع ہونے کے لئے انگریزی کی تعلیم کا بھی انتظام کیا۔[6]

ندوۃ العلماء سے متعلق مفکرین کی آراء

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے متعلق ڈاکٹر سر محمد اقبال لکھتے ہیں کہ "میرا ایک مدت سے عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالک اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، دماغی اعتبار سے ان کی بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں، کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں ندوہ علی گڑھ سے زیادہ کامیاب ثابت ہو۔"[7]

شیخ الازہر ڈاکٹر عبد الحلیم محمود نے ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن کی تقریب جو 1975 میں منعقد ہوئی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "آج پورا عالم اسلام ندوہ کی قابل تحسین و آفرین مسائی کا احساس رکھتا ہے، اور نشرواشاعت کی ان کوششوں اور خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو یہاں انجام دی جارہی ہیں، ان علماء کے کام اور مقام کا بھی اس کو احساس ہے جو غور و فکر میں مشغول ہیں، اور راہ خدا میں ہر طرح کوشش کر رہے ہیں۔"[8]

[5]۔ علماء کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں، سید ابوالحسن علی ندوی، ص 72-73

[6]۔ مدارس اسلامیہ، سید ابوالحسن علی ندوی، ص 82

[7]۔ اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں، اختر راہی، بزم اقبال کلب لاہور، طبع اول 1978ء، ص 188۔

[8]۔ روداد چمن، سید محمد الحسنی ندوی، مجلس صحافت و نشریات، ٹیگور مارگ ندوۃ العلماء لکھنو انڈیا، طبع دوم 2013ء، ص 141

سابق جج اسلامک کورٹ دمشق شام، سابق پروفیسر بغداد یونیورسٹی عراق اور خطہ عرب کے ممتاز ادیب وانشاء پرداز علامہ شیخ علی طنطاوی نے ندوۃ العلماء کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہاہے کہ "ندوہ ایک معتدل اور جامع رستے پر چلنے والا ادارہ ہے، یہ راستہ نہ اپنی منزل سے منحرف ہوا ہے اور نہ اس نے اس مستقیم راہ کو چھوڑا ہے، یہ قدیم مدارس جامع ازہر وغیرہ اور جدید جامعات (یونیورسٹیوں) کے درمیان ایک معتدل اور جامع راستہ ہے، جس میں نہ مدارس کا جمود ہے، نہ جدید جامعات کی جدت پسندی، اس نے ان دونوں کے درمیان کا راستہ اختیار کیاہے اور اس میں کامیاب ہوا ہے۔ میں ایک بار ٹی وی کو انٹرویو دے رہا تھا تو مجھ سے پوچھا گیا کہ آپ بقیہ زندگی کہاں بسر کرنے کے خواہشمند ہیں تو میں نے کہا اگر دمشق نہ جاسکوں اور اور بیت اللہ کے جوار میں رہنا نصیب نہ ہو تو لکھنو جانے کو ترجیح دونگا اور ندوۃ العلماء کی درسگاہ میں قیام کروں، جو ایک پر فضا محل ومقام بھی ہے اور وہاں علماء کی صحبت بھی میسر ہے۔"[9]

ندوہ اور ندویت ایک فکر دو نام

ماسبق میں تفصیل کے ساتھ ندوہ کا تعارف پیش کیا گیاہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ندوہ صرف ایک تعلیم گاہ ہی نہیں بلکہ ایک دعوت اور فکر کا نام ندوہ ہے جس میں دین ودنیا اور جدید وقدیم کی بحث کو دخل نہیں بلکہ ہر صالح کو بغیر کسی رکاوٹ کے قبول کرنے کا جذبہ کا نام ہے۔ ندوہ نے برصغیر میں تعلیم کے میدان میں عظیم انقلاب برپا کیا کہ براہ راست قرآن سے استفادہ کی صلاحیت میں پیدا کی اور عربی زبان وبیان پر طلبہ کو عبور ندوہ کی بدولت حاصل ہوا۔ ندوہ سے استفادہ کرنے والوں نے شرق وغرب اور عرب وعجم میں اپنی علمی وعملی صلاحیت کا لوہا منوایا کہ ندوہ کے فضلاو محبین سر اٹھا کر بڑی سی بڑی مجلس ومنصب پر فائز ہونے کی استعداد رکھتے ہیں۔ تاہم یہ بات ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ ضروری نہیں کو شرق وغرب میں بسنے والے لازماً ندوۃ العلماء کی چہار دیواری میں سکونت اختیار کرکے ندوی ہونے کا اعزاز حاصل کرے بلکہ ہر وہ فرد جو تحریک ندوہ کے اغراض ومقاصد اور دعوت وپیام سے متفق ہو اور ندوہ کے شیوخ واساتذہ سے بالواسطہ یابلاواسطہ استفادہ کرکے ندوہ کے اعتدال وحمیت ایمانی سے معمور پیغام کو اپنالے وہ بھی ندوی کہلوانے کا مستحق ہے۔

اہل ندوہ سے تعلق

ہم (عتیق الرحمٰن) کا تعلق پاکستان کے صوبہ پنجاب کے آخری ڈویژن وضلع ڈیرہ غازیخان سے ہے۔ ہم نے 2002ء میں قرآن کریم حفظ کیا اور درس نظامی کی تعلیم خامسہ تک حاصل کرکے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں بی ایس (آنرز) اصول الدین میں کیا۔ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران 2010ء میں جانشین مفکر اسلام سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ کے

---

[9] ۔ مقدمہ کتاب مسیرۃ الحیاۃ، ص13

نواسے حضرت علامہ سید سلمان حسینی ندوی اسلام آباد ایک کانفرنس میں تشریف لائے۔ مولانا سلما ن حسینی ندوی دامت بر کا تہم سے عدم شناسائی کی وجہ سے باوجود زیارت کے مصافحہ نہ کر سکا، ہمارے محسن و مربی سید حسان اکبر گیلانی کو جب بتایا تو انہوں نے بتلایا کہ یہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نواسے ہیں اور ان کا ہم اپنے ماہنامہ قیام اسلام آباد کے لئے انٹرویو کرنا چاہیں گے۔ مولانا سے تلاش کے بعد رابطہ قائم ہوا مگر وہ اسلام آباد سے کراچی روانہ ہو چکے تھے۔ بعدزاں مولانا کی خواہش پر سوالنامہ بذریعہ ای میل مولانا کو ارسال کیا گیا جن کے تفصیلی جوابات ہمارے شمارہ قیام کی زینت بنے۔

اسلامی یونیورسٹی میں عرب اساتذہ سے کسب فیض کیا تو بہت سے عرب اساتذہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا تذکرہ خیر فرماتے تھے تو دل میں اشتیاق پیدا ہوا کہ مولانا کی کتب کا مطالعہ کیا جائے اس سلسلہ میں مصر کے معزز و محترم اساتذہ ڈاکٹر عبدالمعز ربوشہ الازہری اور ڈاکٹر خالد فواد الازہری نے مفکر اسلام کی کتب کی خریداری میں میری مالی معاونت کی اور مجلس نشریات اسلام کراچی سے مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ کی تمام کتب منگوالیں۔ ان کتب کا بالترتیب مطالعہ شروع کیا تو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی جانب سے ملت اسلامیہ کے ماضی وحال اور استقبال پر گہری نظر کو پڑھ کر دل میں حمیت اسلام کا جذبہ بیدار ہوا اور عزم کیا کہ زندگی کو اسلام و مسلمانوں کی سرفرازی کے لئے بسر کرنا ہے۔ کلمہ حق سے اعراض نہیں کرنا اور دین کی دعوت کو حکمت و بصیرت کے ساتھ اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی دامت بر کا تہم جو مولانا ابوالحسن علی ندوی کی فکر کے زندہ و جاوید امین تھے سے دلی محبت و وارفتگی کا جذبہ مستحکم ہوا۔ ندوہ و اہل ندوہ سے محبت و عقیدت کا سلسلہ دراز ہوا تو بذریعہ فیس بک مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے پرنسپل ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی اور اپنی زندگی کا قیمتی حصہ عرب ممالک میں بسر کرنے والے برادرم سرور خان ندوی صاحب سے ربط قائم ہوا۔ اسی دوران ڈاکٹر طارق ایوبی نے علی گڑھ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور عصر حاضر کے چیلنجز پر کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تو راقم نے "عصری جامعات کے طلبہ کی فکری تربیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی افکار کی روشنی" کے عنوان سے مقالہ ترتیب دیا جو منظور ہوا اور فروری 2013ء میں علی گڑھ حاضر ہو کر پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

راقم نے عرب اساتذہ کی تائید وحمایت اور معاونت کی وجہ سے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتب کا جب مطالعہ کیا تو جسم کارواں رواں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے پر امید ہوا۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، اسلامیت و مغربیت کی کشمکش اور پاجا سراغ زندگی کے مطالعہ کے بعد فیصلہ کیا کہ بی ایس (آنرز) اصول الدین کے لئے جو مقالہ لکھنا ہے وہ مولانا علی میاں کے افکار کی روشنی میں لکھا جانا چاہیے چنانچہ "الاصلاح الاسلامی للعصر الجاہلی من ضوء فکر ابی الحسن الندوی" رقم کیا۔ اور اب راقم مولانا سید ابوالحسن علی

ندوی رحمۃ اللہ کے افکار کی روشنی میں "دینی مدارس کے نظام تعلیم و تربیت" پر ایم فل اسلامیات کا مقالہ وفاقی اردو یونیورسٹی اسلام آباد کے لئے رقم کر رہا ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کے افکار کی عملی و زندہ جھلک مولانا سید سلمان حسینی ندوی دامت برکاتہم میں دیکھی تو 2010ء سے اب تک گاہے بگاہے مولانا سے بذریعہ ای میل، واٹس ایپ رابطہ ہوتا رہتا ہے۔ بالخصوص مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مناظر احسن گیلانی اور پھر علامہ سید سلمان حسینی ندوی وحدت نظام تعلیم کی بات پر بہت زیادہ زور دیتے تھے تو اس سے متاثر ہو کر راقم نے 2013ء "وحدانی نظام تعلیم فورم پاکستان" قائم کرنے کا فصلہ کیا تو علامہ سید سلمان ندوی صاحب کو خاکہ تنظیم پیش کیا جس کو مولانا نے سراہتے ہوئے عملی تعبیر کا تقاضا کیا۔ الحمد للہ اب 2019ء سے ڈیرہ غازیخان میں جامعہ اصحاب صفہ کے نام سے دینی ادارہ قائم کیا اور وحدانی سکول سسٹم کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اللہ کہ فضل و کرم سے یکم جون 2020ء سے تعلیم سلسلہ کا آغاز کیا جا چکا ہے اب تک 300 کے قریب طلبہ و طالبات نے داخلہ حاصل کیا اور 150 سے زائد طلبہ و طالبات بعد از نماز فجر سے بعد از نماز عشاء قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ پونے دو سال میں 30 طلبہ و طالبات نے ناظرہ قرآن کریم مکمل کیا ہے۔ جامعہ میں تعلیم قرآن کریم کے ساتھ روزمرہ کی سنتوں اور اسلامی تربیت و اخلاق کی تعلیم کا سبق کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ جامعہ میں تعلیم بالغان اور عصری تعلیم کا بھی نظم بقدر استطاعت قائم کیا ہوا ہے۔ تعمیراتی منصوبہ کی عدم تکمیل کے باعث باضابطہ سکول کی تعلیم کا آغاز ابتک نہیں کیا جاسکا دعا ہے اللہ تعالیٰ جامعہ کے تعمیراتی منصوبہ جات کو جلد پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ برصغیر میں اسلام کی دعوت حکمت و بصیرت کے ساتھ تعلیمی و دعوتی میدان میں پیش کرنے کی داغ بیل ڈالنے والے بانیان و متعلقین تحریک ندوہ کے درجات کو بلند فرمائے اور ہمیں تادم زیست اسلام و اہل اسلام کی خدمت کرنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین

مضمون میں طوالت کے پیدا ہو جانے پر معذرت خواہ ہوں۔